دین کی حمیت آپ کو سرگرم رکھے گی..... شاخوں کے بجائے جڑ پر آپ کی نظر رہے گی۔

علمائے عزیز! بظاہر آپ کے طلب علم کا زمانہ ختم ہوگیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے طلب علم اور تحقیق وجستجو کا زمانہ اب شروع ہوا ہے۔اس سے پہلے جو سال بھی آپ نے علم کی تحصیل میں صرف کیے ان کا منشا اپنے اندر علم کی استعداد اور تحقیق کا سامان فراہم کرنا تھا۔آج آپ کو جو سند دی جارہی ہے' وہ اس بات کی ڈگری نہیں ہے کہ آپ کا علم درجہ کمال کو پہنچ گیا' جس میں اضافے کی گنجائش نہیں..... بلکہ اس بات کی ہے کہ آئندہ حصول کمال اور تحقیق کی استعداد آپ میں بیدار ہوگئی ہے، جس سے اگر آپ کام لیں تو منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔یہ تصور انتہائی ذہنی پستی کی کلید ہے کہ طالبعلمی میں جو کچھ پڑھ لیتے ہیں اسی کو منتہا جاننے لگیں۔ایک سچے عالم کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر طالبعلم ہی رہتا ہے۔اس کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نئی چیز کی واقفیت اور کسی نیکی کی خدمت میں بسر ہوجاتی ہے۔مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اکثر لوگ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علم کی ہر کتاب بیچ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ طلب علم کی ہر کوشش ختم ہوگئی۔آج یہ حال ہے کہ آمد ورفت کی سہولت اور چھاپے کی آسانی ہمارے اسلاف کے دفینوں کو کھود کھود کر برسر بازار سجا کر پیش کررہی ہے۔ہر روز ہمارے بزرگوں کی کوئی نہ کوئی کتاب سامنے آتی ہے اور مشرق ومغرب کے مشتاق اس کو ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں۔لیکن جو گروہ اس تحفہ کا سب سے زیادہ مستحق ہوسکتا تھا' وہ اپنے تغافل اور سست کاری سے اعراض برت رہا ہے۔

علمائے عزیز! ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں دنیا کی بہتات تھی ،دولت کی کثرت تھی ،تجارت کا فروغ تھا،حکومت وسلطنت ان کے ہاتھوں میں تھی۔اس وقت کے علماء نے اپنی حکمت ربانی سے یہ صحیح سمجھا کہ مسلمانوں کا دولت میں انہماک ،کسب زر میں زیادہ مشغولیت ،حکومت اور سلطنت میں استغراق ان کے دین کے لیے مضر ہے۔اس لئے انہوں نے ترک دنیا اور زہد وقناعت کا برمحل وعظ فرمایا۔لیکن اب حالت پلٹ گئی ہے،فقر وفاقہ چھایا ہوا ہے،مفلسی ان کے لئے فتنے کا سامان ہے، دولت ان سے جاچکی ہے۔ضرورت ہے کہ ہمارے واعظ اور علماء اپنی تقریروں کا رخ پھیریں اور اپنے مواعظ کا موضوع سخن بدلیں۔تاکہ مسلمانوں میں زندگی کی روح پیدا ہو،ان میں زمانے کے مقابلے کا حوصلہ آئے ،اپنی محنت اور سعی وجانفشانی سے وہ پوزیشن حاصل کرلیں جو دنیا میں فرزندان توحید وجاں نثاران سنت نبویہ کا حق ہے۔

﴿قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده والطيبت من الرزق قل هي للذين امنوا في الحيوة الدنيا خالصة يوم القيمة كذلك نفصل الأيت لقوم يعلمون ۞﴾(الأعراف:٣٢)

۞۞۞۞۞۞

مسجد کے مُلا کی عظمت

راشد صدیقی

مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد نہ صرف شہروں اور قصبوں کے نام بگڑے تھے، بلکہ برہام پور کے کچھ دور افتادہ علاقوں میں مسلمانوں کی اپنی حالت بھی عبرتناک حد تک ناگفتہ بہ تھی۔ سنگلاخ پہاڑیوں اور خاردار جنگل سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں مسلمانوں کے بیس پچیس گھر آباد تھے۔ ان کی معاشرت ہندوانہ اثرات میں اس درجہ ڈوبی ہوئی تھی کہ رومیش علی، صفدر پانڈے، محمود مہنتی، کلثوم دیوی اور پربھادی جیسے نام رکھنے کا رواج عام تھا۔ گاؤں میں ایک نہایت مختصر کچی مسجد تھی، جس کے دروازے پر اکثر تالا پڑا رہتا تھا۔ جمعرات کی شام کو دروازے کے باہر ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ نہا دھو کر آتے تھے اور مسجد کے تالے کو عقیدت سے چوم کر ہفتہ بھر کے لئے اپنے دینی فرائض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔

ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک مُلّا صاحب اس گاؤں میں آکر ایک دو روز کے لیے مسجد کو آباد کر جاتے تھے۔ اس دوران اگر کوئی شخص وفات پا گیا ہوتا، تو مولوی صاحب اس کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ نوزائیدہ بچوں کے کان میں اذان دیتے تھے۔ کوئی شادی طے ہوگئی ہوتی تو نکاح پڑھا دیتے تھے۔ بیماروں کو تعویذ لکھ دیتے تھے۔ اور اپنے اگلے دورے تک جانور ذبح کرنے کے لیے چند چھریوں پر تکبیر پڑھ جاتے تھے۔ اس طرح ملا صاحب کی برکت سے گاؤں والوں کا ''دین اسلام'' کے ساتھ ایک کچا سا ''رشتہ'' مضبوط دھاگے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔

برہام پور گنجم کے اس گاؤں کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار میرے دل میں مسجد کے ملا کی عظمت کا کچھ احساس پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں ''ملا'' اور ''مولوی'' کے القاب علم و فضل کی علامت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سرکار انگلشیہ کی عملداری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم اور ثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ و روغن چڑھتا گیا، اسی رفتار سے ملا اور مولوی کا تقدس بھی پامال ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ یہ دونوں تعظیمی و تکریمی الفاظ تضحیک و تحقیر کی ترکش کے تیر بن گئے۔ داڑھیوں والے ٹھوٹ اور ناخواندہ لوگوں کو مذاق ہی مذاق میں ''ملا'' کا لقب ملنے لگا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور دفتروں میں کوٹ پتلون پہنے بغیر دینی رجحان رکھنے والوں کو طنز و تشنیع کے طور پر ''مولوی'' کہا جاتا تھا۔ مسجدوں کے پیش اماموں پر جمعراتی، شبراتی، عیدی، بقرعیدی اور فاتحہ درود پڑھ کر روٹیاں توڑنے والے، قل اعوذ وئے ملاؤں کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔

لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھوں کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ محلے کی مسجد میں ظہر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ کس طرح ہوتی رہتی ہے؟ کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں میں نرم و گرم لحافوں میں لپٹے ہوئے اجسام کو اس بات پر کبھی حیرت نہ ہوئی کہ اتنی صبح منہ اندھیرے اٹھ کر فجر کی اذان اس قدر پابندی سے کون دے جاتا ہے؟ دن ہو یا رات'